ماسٹر رام چندر: اردو کے اوّلین مضمون نگار

ڈاکٹر محمد کاشف

شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد

اردو میں لفظ مضمون کا اطلاق ہر اس طرح کے نثری فن پارے پر کیا جانے لگا ہے جس میں کوئی کہانی، قصہ بیان نہ کیا گیا ہو۔ یہ لفظ یا اصطلاح دراصل انگریزی لفظ ''Essay'' کے متبادل کے طور پر اردو میں بہت ہی غیر محتاط طریقے سے استعمال کیا گیا۔ اسّے اور اس کی مختلف قسموں کے لیے یہی اصطلاح اپنائی گئی۔ اسّے ایک صنف کی حیثیت سے اردو میں انگریزی کے توسط سے آئی۔ مغربی ادب میں اسّے اپنے مختلف مراحل و مدارج طے کرتے ہوئے ۱۹ویں صدی تک ایسے مقام تک پہنچی ہے جہاں اس میں اتنی وسعت پیدا ہوجاتی ہے کہ اسے ایک متعینہ معنی و مفہوم میں قید کرنا ایک مشکل کام ہے۔ اسّے کی اسی وسعت اور ہمہ گیری کو دیکھتے ہوئے ہڈسن کو اپنی کتاب Introduction To Study Of Litrature میں یہ بتانا پڑا کہ ''اسّے کے مواد اس کے موضوعات اس کے مقاصد اور اسالیب میں اتنی ہمہ گیری اور بوقلمونی ہے کہ نقاد کے لیے یہ بہت مشکل ہوجاتا ہے کہ چند اصولوں اور ضابطوں میں اس کے وسیع تصور کا احاطہ کرسکے۔ ادب میں شاید ہی کوئی صنف اتنی متلون اور مابہ انتزاع ہوگی جتنی کہ اسّے کی صنف ہے۔'' (اردو مضمون کا ارتقا۔ سیدہ جعفر۔ ص:۶)

اسّے کو مضمون یا مقالہ، سنجیدہ قسم کے فلسفیانہ مضامین کے لیے بھی استعمال کیا گیا، لیکن اسّے میں کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو اسے ایک عام فلسفیانہ یا سنجیدہ مضامین سے الگ کرتی ہیں۔ اسّے کی انہی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیکن کہتا ہے: ''اس کا (اسّے) مقصد یہ بتانا ہے کہ اسّے کسی موضوع کی مکمل اور جامع تفتیش نہیں بلکہ پرلطف اور آزادانہ انداز میں بے ساختگی اور بے تکلفی کے ساتھ جذبات و خیالات کی عکاسی کا نام ہے۔'' (اردو مضمون کا ارتقا۔ سیدہ جعفر۔ ص:۵)

اسّے میں بیک وقت فکر انگیزی، رعنائی خیال، دلفریبی، اسلوب کی شگفتگی، آزادہ روی، ذہنی ترنگ، خود کلامی، ذوق آگہی، تابنا کی و تازگی سبھی کچھ ہوتا ہے جو اپنے قاری کو فکری و جذباتی سطح پر متاثر کرتا ہے۔

ایک انگریز مفکر نے اسے کی دو قسمیں گنائی ہیں۔ ایک فارمل یا غیر شخصی دوسرا انفارمل یا شخصی۔ مؤخر الذکر کو اسے یا آج کل کی اصطلاح میں انشائیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور فارمل اور غیر شخصی اسے میں ہر طرح کے مضامین شامل ہیں جس میں کسی خاص موضوع کے تحت سنجیدگی سے اظہار خیال کیا گیا ہو۔ اس طرح کے غیر شخصی مضامین کے لیے اردو میں آج کل مضمون کی اصطلاح اور شخصی مضمون کے لیے انشائیہ کا لفظ عام طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ اس طرح سے مضمون اور انشائیہ کے فرق کو واضح کرتے ہوئے سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

> ''مضمون میں معلومات کا بھی دخل ہوتا ہے اور انشائیہ میں محض تاثرات کی کارفرمائی۔ مضمون نگار اپنی بصیرت، متانت اور آگہی کی مدد سے ایک اچھا رہبر ثابت ہوسکتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنی چہل اٹکھیل اور آشفتہ بیانی کے ساتھ ایک اچھے رفیق کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ مضمون نگاری میں خیال انگیزی پائی جاتی ہے اور انشائیہ میں تخیل پرستی۔ مضمون نگار پاسبان عقل کی معیت سے گھبراتا نہیں، انشائیہ نگار دل وحشی کا مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے۔ انشائیہ ادب لطیف کے زمرے میں آتا ہے وہ حس و تاثراتی و جمالیاتی رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ مضمون نگار اپنے موضوع کا خارجی جائزہ بھی پیش کرسکتا ہے جب کہ انشائیہ نگار موضوع سے متعلق اپنے ذاتی تاثرات کو داخلیت کی فضا میں ابھارتا ہے۔ مختصر یہ کہ مضمون، مقالہ اور انشائیہ بظاہر مشابہ ہوتے ہوئے بھی اپنے ادبی خدوخال کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف محسوس ہوتے ہیں۔'' (اردو مضمون کا ارتقا، سیدہ جعفر، ص:۱۴)

سید ظہیر الدین مدنی کے خیال میں کسی نثری پارہ میں اگر شخصیت کا پرتو ہو اگرچہ اس میں فلسفیانہ اور اخلاق آموز باتیں ہی کیوں نہ کہی گئی ہوں، مگر اسّے ہونے کے لیے اس کا غیر مربوط ہونا اور اسلوب کا اچھوتا پن ضروری ہے۔ انھوں نے بھی اسیز کی دو قسموں کا تذکرہ کیا ہے پہلی قسم رسمی دوسری قسم کے اسیز کو غیر رسمی یعنی ذاتی اور شخصی کہا ہے اور دونوں کے لیے انھوں نے اسیز کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اسیز کی اصطلاح کے حوالے سے ظہیر الدین مدنی اپنی کتاب اردو

اسیز میں لکھتے ہیں ''اردو میں دونوں قسم کے اسیز موجود ہیں، مگر ان کو نہ کوئی نام دیا گیا نہ ہی انگریزی لفظ اسّے نگاری اپنایا گیا ہے۔ اردو میں ہر ایک کو مقالہ کہا جاتا ہے۔ اردو میں مقالہ وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ ایک معمولی مضمون سے لے کر ٹھوس علمی مضمون تک کو مقالہ کہا جاتا ہے۔ ہم اس موقع پر پہلی قسم کے اسیز کو مقالہ ہی کہیں گے، لیکن دوسری قسم کے مخصوص ادب لطیف کے لیے اسّے اور اسیز کا لفظ استعمال کریں گے۔'' (اردو اسیز ص:۲۱)

میرے خیال میں اسّے کو بحیثیت صنف ادب اردو میں انشائیہ کا نام دیا جاتا ہے، لیکن سید ظہیر الدین مدنی انشائیہ لفظ کو اسّے کی صنف کے لیے استعمال نہیں کرتے ہیں بلکہ خاص طرح کے نثری پارہ کو جس میں صرف جوانی کی ترنگ اور تخیل کی اڑان ہو، مگر اس میں تجربہ اور مشاہدہ کی پختگی شامل نہ ہو ایسے مضامین کو انشائیہ یا ادب لطیف کا نام دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں یہ اسّے نہیں ہیں۔ ان کے یہاں اسّے اور انشائیہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

پروفیسر محمد حسنین نے اسّے کے لیے انشائیہ کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسے مضمون اور مضمون نما تحریروں سے ممیّز کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں انشائیہ کا کسی نثری فن پارہ سے قریبی تعلق ہے تو وہ مقالہ ہے۔ بقول ان کے ''ادب کی مختلف اصناف میں اس کا رشتہ مقالہ سے قریب ہے۔ کہانی کی اصناف بھی داستان، ڈراما، ناول، افسانہ اور مثنوی سے اس کا واسطہ نہیں۔ باعتبار صنف اس کا موازنہ مقالہ سے کیا جاسکتا ہے'' (اردو نثر کا فنی ارتقا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ص:۲۱۲)

پروفیسر محمد حسنین نے اپنی کتاب ''انشائیہ اور انشائیے'' میں مقالہ اور انشائیہ کا موازنہ کرتے ہوئے ان کی مختلف خصوصیات کو ابھارا ہے اور اس تقابل سے مقالہ اور انشائیہ بالکل دو الگ روپ میں واضح ہوکر سامنے آجاتے ہیں۔ مقالے میں سنجیدگی، علمیت، متانت، بصیرت ہوتی ہے۔ مقالہ نگار نفس موضوع پر ارتکاز کرتا ہے، مقالے سے ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے جب کہ انشائیہ میں کسی بات پر روشنی تو ڈالی جاتی ہے، لیکن روشنی رنگا رنگ ہوتی ہے۔ انشائیہ پڑھنے کے بعد عام حقیقتیں آشکار ہوتی ہیں جو ہماری نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ انشائیہ کی صنف کیف انگیزی، آوارہ خیالی، گپ بازی اور روشن خیالی جیسے عناصر سے پر ہوتی ہے وہ ہمیں آسودگی اور راحت بخشتی ہے۔

انشائیہ یا اسّے بحیثیت مخصوص صنف کے، اردو میں اس کا آغاز مضمون نگاری یا مقالہ نگاری کے نام سے ہوا۔ یہ انشائیہ کی صنف اردو میں مغرب سے آئی۔ اردو میں اس کا آغاز ایک خاص طرح کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی ماحول میں ہوا۔

انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے وارد ہوئے، لیکن یہاں کی مرکزی حکومت کی کمزوری سیاسی، سماجی، فلسفیانہ اور انتشار کا فائدہ اٹھا کر دھیرے دھیرے ہندوستان کے کچھ علاقوں پر قابض ہوگئے۔ انیسویں صدی کے آغاز سے ہی تقریباً پورے ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط اور غلبہ کی راہ ہموار ہوگئی۔ اب ان کا کوئی بھی ہندوستان میں مدمقابل نہ رہا۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے جہاں ہندوستان کا سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی ڈھانچہ شکست وریخت سے دوچار ہوا وہیں انگریزی حکومت کی برکات اور ان کی سائنسی وعلمی ترقیات کے اثرات بھی ظاہر ہونے لگے۔ اثرات بالواسطہ طور پر ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ پر پڑ رہے تھے۔ بھلے ہی انگریزوں کے مقاصد سامراجی تھے۔ وہ ہندوستان کو ایک خام مال پیدا کرنے والے ملک کے طور پر دیکھ رہے تھے، لیکن انتظامی ضرورتوں اور ہندوستانیوں پر اپنی خیرخواہی اور خدا کی طرف سے بھیجے گئے انصاف پرور حاکم کے طور پر اپنی شبیہ قائم کرنے کے لیے کچھ ایسے رفاہی اور اصلاحی کام کئے جس کے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی پر زبردست اثرات مرتب ہوئے۔

ہندوستان میں جدید تعلیم کا آغاز دراصل عیسائی مشنریوں اور چند سرگرم انگریز کارکنوں کی کوششوں سے ہوا، مگر جلد ہی سیاسی ضروریات کے تحت اس کی اہمیت کا احساس انگریز حکام کو بھی ہونے لگا۔ برطانوی پارلیامنٹ نے ہندوستان میں تعلیم کی طرف توجہ کی اور ۱۸۱۳ء میں پہلی بار ایک لاکھ روپے کی رقم تعلیم پر خرچ کے لیے منظور کی۔ اس وقت مسئلہ یہ تھا کہ مشرقی علوم والسنہ کی تعلیم دی جائے یا انگریزی زبان اور مغربی علوم کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔ لارڈ میکالے نے انگریزی اور مغربی علوم کو فروغ دینے کی وکالت کی۔ اس تعلیمی پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی باشندوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں لایا جائے جو کمپنی کے نظام کے قیام واستحکام میں معاون ثابت ہوسکے۔

اس سلسلے میں دلی کالج کا قیام صرف انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کے مقاصد کو ہی پورا نہیں کررہا تھا بلکہ یہ ادارہ شمالی ہندوستان میں سیاسی، قومی، تعلیمی، تہذیبی اور اصطلاحی سرگرمیوں کی آماجگاہ کے طور پر ابھرا۔ ہم اسے صرف تعلیمی ادارہ نہیں سمجھ سکتے بلکہ یہ ایک وسیع قومی تحریک کا ایک اہم جز تھا۔ اس کالج کا مقصد مشرق ومغرب کے ذہنی بعد کو کم کرنا بھی تھا۔ اس تحریک کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مشرق ومغرب کی اعلیٰ اقدار کو ایک امتزاجی شکل عطا کی۔ ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز اگرچہ بنگال میں ہوا، مگر شمالی ہند میں دلی کالج کی سرگرمیوں کے ذریعے نشاۃ ثانیہ کی لہر پھیلی۔ جہاں سائنس کی طرف زیادہ توجہ دی گئی اور ادب میں حقیقت پسندی اور عقلیت کے رجحان کی داغ بیل اسی ادارہ میں ڈالی گئی۔ سائنسی مضامین کو اردو میں منتقل کرنے کا کام کامیاب طریقے سے یہاں انجام دیا گیا۔ جس کی وجہ سے

اردو نثر کے فروغ کی راہ ہموار ہوئی۔اردو نثر کے ارتقا میں دلّی کالج نے نمایاں خدمات انجام دیں۔فورٹ ولیم کالج کے تحت نثری اسالیب میں جو ارتقائی رجحان پیدا ہوا انھی کو آگے لے جانے اور وسعت دینے کا اصل کام دلی کالج کے ذریعے انجام دیا۔گویا دلی کالج،علی گڑھ تحریک اور فورٹ ولیم کالج کے درمیان کی ایک کڑی تھی۔بقول صدیق الرحمان قدوائی:

''اردو نثر کی تاریخ میں دلی کالج،علی گڑھ تحریک اور فورٹ ولیم کالج کے درمیان ایک کڑی ثابت ہوا۔فورٹ ولیم کالج کے بعد نثر پر جمود طاری ہونے کے بجائے دلی کالج اور اس سے متعلق حضرات کی بدولت چند اعلیٰ روایات کی داغ بیل پڑی۔اردو ادب میں نمو اور بالیدگی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔''

(ہندوستان میں فکری وتہذیبی اصلاح کا آغاز
اور ماسٹر رام چندر۔ص:۷۸)

دلی کالج کی ایک اہم امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اردو زبان کو بطور ذریعۂ تعلیم اپنایا گیا۔یہاں اردو زبان کے ذریعے مغربی علوم کی اشاعت کو ترجیح دی گئی۔اس کے لیے پہلی بار اعلیٰ پایہ کی انگریزی تصانیف کو اردو میں منتقل کرنے کا کام شروع ہوا۔تراجم کے کام نے اردو نثر کے دائرے کو وسعت بخشی اور ساتھ ہی علمی مضامین کی اردو میں منتقلی سے اردو میں مضمون نگاری کی داغ بیل پڑی۔بقول صدیق الرحمان قدوائی:

''دلی کالج کے حلقے نے اردو میں متنوع مضامین کے ایک بیش بہا ذخیرے کا اضافہ کیا۔یہی مضامین شمالی ہند میں ذہنی بیداری کے آغاز کا سبب بنے....دلی کالج کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو زبان اور اردو داں حلقے کو یورپی ادب اور فلسفے سے آشنا کرایا،فکر وخیال کے دھاروں پر جغرافیائی حدود کے جو بندھ تھے وہ ٹوٹنے لگے اور اردو بھی فکری اعتبار سے جدید عالم گیر تہذیبی وحدت کا حصہ بن گئی۔'' (ایضاً ص:۷۹)

اردو نثر خاص طور سے اردو مضمون نگاری میں جو ترقی ہوئی وہ تراجم کے علاوہ صحافت کی بدولت ہوئی۔پریس کے قیام اور اخبارات ورسائل کے اجرا سے پڑھنے والوں کے حلقے میں توسیع ہوئی اور ادب امرا اور خواص کے دربار سے نکل کر عام پڑھے لکھے لوگوں تک جا پہنچا۔لکھنے والے عام پڑھنے والے لوگوں سے قریب تر ہوئے۔سماجی افکار اور نئے مسائل پر شعوری اظہار خیال کیا جانے لگا۔نثر میں حقیقت پسندی،مقصدیت،افادیت اور نقطۂ نظر کی اہمیت کا احساس نمایاں ہونے لگا۔ان بدلتے ہوئے حالات میں سماجی تغیرات کا ادراک رکھتے ہوئے جس ادارے نے اردو زبان وادب اور خاص طور سے اردو مضمون نگاری کے آغاز وارتقا میں اہم ترین حصہ لیا وہ دلی کالج تھا۔اس ادارہ کے سب سے ممتاز اور اہم ترین رکن ماسٹر رام چندر تھے۔

انھوں نے اسی کالج میں تعلیم حاصل کی اور یہیں پر استاد کی حیثیت سے تقرر ہوئے۔ان کی کوشش یہی تھی کہ جاگیردارانہ نظام کے سیاسی وسماجی خیالات کی تردید کی جائے اور ایسے نظریات کی تبلیغ کی جائے جو بدلتے ہوئے حالات اور صنعتی دور کے تقاضوں کے مطابق ہوں۔ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان بھی نئے دور میں قدم رکھے۔اپنے ان نظریات کی تبلیغ کے لیے تصنیف وتالیف،تراجم اور صحافت کا سہارا لیا۔علمی موضوعات پر انھوں نے مختلف کتابیں اور مضامین لکھے۔ان علمی موضوعات کو آسان اسلوب میں ڈھالنا آسان کام نہ تھا،لیکن رام چندر نے ان موضوعات کو آسان سادہ سلیس زبان میں پیش کیا۔اس سلسلے میں ان کا یہ کام بہت ہی اہم اور بنیادی ہے۔علمی موضوعات سماجی واخلاقی مسائل،تاریخی واقعات کے علاوہ سوانح پر رام چندر نے مختلف مضامین لکھے۔

رام چندر انگریزی زبان وادب سے براہ راست واقف تھے۔بہت سے انگریزی ادیبوں کی تخلیقات کا مطالعہ کیا تھا۔ان کے کلام اور مضامین سے استفادہ بھی کیا۔انھوں نے بیکن کے اسلوب کو اپنایا۔رام چندر کے زیادہ تر مضامین فوائد الناظرین اور محبّ ہند میں شائع ہوئے۔عجائبات روزگار اور تذکرۃ الکاملین بھی دراصل مضامین کے مجموعے ہیں۔

دوران تعلیم ہی انھوں نے مضامین لکھنا شروع کر دیا تھا۔سیاسی، اخلاقی،تمدنی اور معاشرتی موضوعات پر متعدد مضامین لکھے جن کا مقصد ملک میں جدید خیالات کی ترویج واشاعت تھا۔وہ عام لوگوں کو دعوت فکر دینا چاہتے تھے۔اس لیے ان کا طرز تحریر بہت صاف ستھرا،سادہ اور سلجھا ہوا تھا۔رام چندر دراصل اپنے مضامین کے ذریعہ قدامت پرستوں کے خیالات وعقائد پر ضرب لگانا چاہتے تھے۔سائنسی ترقیات اور نئے نظریات سے عام لوگوں کو آشنا کرانا چاہتے تھے۔

رام چندر کی اولیات میں یہ بھی ہے کہ انھوں نے حالات کو سمجھتے ہوئے کتابیں اور علمی مضامین لکھے۔جب اس زمانے میں گل وبلبل اور عشق وعاشقی کی باتوں سے شاعروں اور ادیبوں کا ذہن آگے نہیں جاتا تھا۔اسی حوالے سے ان کی اولیت پر تبصرہ کرتے ہوئے سیدہ جعفر لکھی ہیں:

''رام چندر اردو کے وہ پہلے مصنف ہیں جنھوں نے گرد وپیش کے حالات کو سمجھتے ہوئے ان کے تقاضوں کے مطابق ایسی کتابیں لکھیں جن میں شمع وپروانہ کی داستانوں کے بجائے احتجاجی فلاح اور عوام کی تعلیم اور ترقی کے سامان موجود تھے۔رام چندر کی ان علمی تصانیف نے اردو زبان وادب میں ایک نیا راستہ کھول دیا۔''

(ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ،ص:۳۸)

رام چندر نے اپنے مضامین میں زمانے کے سیاسی حالات اور سماجی

رجحانات کی تصویریں پیش کیں۔ وہ ادب کی افادیت کے قائل تھے۔ انھوں نے مضامین کی بنیاد روزمرہ کے واقعات اور زندگی کے حقائق و تجربات پر رکھی تھی اور کشمکش حیات سے جو نتائج اخذ کیے وہ یاسیت اور فراریت سے مملو ہونے کے بجائے زندگی کو حوصلہ دینے والے تھے۔ عقلیت، حقیقت نگاری مادیت کو ادب میں سمونے کا سہرا دراصل ماسٹر رام چندر کے سر ہی جاتا ہے۔ سرسید کے مضامین میں جو ارتقائی کیفیت دکھائی دیتی ہے اس کا آغاز دراصل رام چندر کی تحریروں سے ہی ہوا۔ مضمون نگاری کو انھوں نے شعوری طور پر اپنایا۔ ان سے پہلے مضمون نگاری کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ اس لیے سیدہ جعفر کا یہ خیال کہ مضمون نگاری کے ارتقا میں سرسید کے مضامین ایک تو سبع ہیں آغاز نہیں حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''ماسٹر رام چندر اردو کے پہلے مضمون نگار ہیں جنھوں نے شعوری طور پر اردو ادب میں اس صنف کی ابتدا کی۔ سرسید کے مضامین اس ابتدا کا زیادہ نکھرا ہوا اور ترقی یافتہ روپ ہیں۔ انھوں نے مضمون نگاری کو اتنی بلندیاں، نئی وسعتیں اور نئی فنی تراش خراش دی اور اسے سڈول بنایا'' (ایضاً ص:۵۲)

سیاسی، سماجی اور تہذیبی انحطاط اور زوال کا عکس بھی رام چندر کے مضامین میں نمایاں ہے۔ ان کے اس طرح کے مضامین میں غلامی اور محرومی کا احساس صاف طور پر ہوتا ہے۔ کہیں کہیں اپنے مضامین میں انھوں نے انگریزوں کے استحصالی رویہ پر دبی زبان سے احتجاج بھی کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ رام چندر انگریزوں کی ہر چیز پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیتے تھے۔ وہ اس طرح کی غلامانہ ذہنیت کے خلاف تھے۔ ہندوستانیوں کی غلامانہ ذہنیت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے ایک مضمون ''حب الوطنی'' میں لکھتے ہیں:

''کم ہمتی جو اہل ہند کا خاصہ ہے اس کے باعث وہ ہمیشہ غلامی میں رہتے ہیں اور دیکھیے کب تک رہیں گے۔ ان کو آزاد گورنمنٹ کا تصور بھی نہیں یہ اثر تعلیم کا ہے جو یہاں کے لوگ پاتے آئے ہیں۔'' (ایضاً ص:۵۵)

اس مضمون میں جس طرح حالات کا جائزہ لیا ہے اس سے لگتا ہے انھیں سیاسی حالات کا کتنا گہرا شعور تھا۔ ماسٹر رام چندر نے اپنے کچھ مضامین میں انگریزی استبداد کے خلاف اپنے اضطراب کا اظہار بھی کیا ہے اور حکومت کے کاموں پر شدید نکتہ چینی بھی کی ہے۔ اس سے ان کی حب الوطنی کے جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ موجودہ حالات و واقعات پر جس طرح سے انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ان کے گہرے سماجی و سیاسی و تہذیبی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ سماجی مسائل کے حل کی طرف ان کے مضامین میں اشارہ ملتا ہے۔ امرا کی تعیش پسندی اور اخلاقی پستی اور ناعاقبت اندیشی پر بھی اپنی اضطرابی کیفیت کو اجاگر کیا ہے۔ قوم کی بے عملی، کاہلی، سماجی بے حسی اور غلامانہ ذہنیت پر بعض مضامین میں شدید نکتہ چینی کی ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے لگتا ہے کہ گردوپیش کے سیاسی، معاشی اور تمدنی حالات پر ان کی کتنی گہری نظر تھی۔ ان تمام موضوعات کو اپنے مضامین میں سمو دیا ہے۔ سیدہ جعفر کا یہ خیال کہ ان کے مضامین میں روح عصر موجود ہے، صد فی صد صحیح ہے۔

جہاں تک تعلیم کا سوال ہے تو رام چندر جدید تعلیم کے حامی تھے۔ تعلیم سب کے لیے نظریہ کے قائل تھے۔ رجعت پسند لوگوں کی مخالفت کے باوجود تعلیم نسواں کی حمایت کی۔ اس سلسلے میں ان کا مضمون ''حال تربیت لڑکیوں کا'' بہت اہمیت کا حامل ہے۔

رام چندر کے مضامین سے اردو میں عقلیت، افادیت اور اصلیت کی ابتدا ہوتی ہے۔ رام چندر کی یہ خواہش تھی کہ اردو زبان و ادب میں مغربی ادبیات کی جاندار اور توانا روایت کو منتقل کیا جائے تاکہ ان کے ہم وطنوں کی علمی اور معاشرتی اصلاح اور رفاہ عام میں مدد ملے۔ اس لیے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ انگریزی ادبیات سے اردو زبان کو روشناس کرانے میں ماسٹر رام چندر کو اولیت حاصل ہے۔

جہاں تک رام چندر کے مضامین کے اسلوب اور زبان و بیان کا تعلق ہے تو سادہ اور سلیس نثر کو انھوں نے اپنایا۔ سادہ اور سلیس نثر کا آغاز فورٹ ولیم کالج کے تحت ہو چکا تھا، لیکن اس کا دائرہ بہت محدود تھا۔ رام چندر کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی مضمون نگاری سے اردو نثر کو مزید ترقی کی راہ پر لگایا۔ فروغ صحافت کی وجہ سے اردو نثر عوام سے قریب ہوگئی۔ ان کی نثر کی خوبی لطافت اور حسن اظہار میں نہیں ہے بلکہ رفعت فکر و وضاحت اور افادیت خیال پر ہے۔ انھوں نے جو مضامین لکھے وہ سنجیدہ مسائل و موضوعات سے متعلق تھے۔ اس لیے ان میں دلکشی اور رنگینی ڈھونڈنا فضول ہے۔ ان کی نثر تبلیغی نثر تھی جس میں اپنی بات کو قاری تک پہنچانا اور قائل کرنا اور اصلاح کی طرف مائل کرنا زیادہ اہم تھا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ رام چندر کی نثر پرانی مسجع و مقفیٰ نثر اور سرسید اور حالی کی جدید نثر کے مابین ایک درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیے اس پر قدیم نثر کے کچھ اثرات جملے کی ترتیب کے حوالے سے در آئے ہیں۔ دوسری طرف ان کی نثر میں عام طور پر انداز گفتگو کا گہرا رنگ ملتا ہے۔ مثلاً جمع بنانے میں یا کہیں الفاظ کے املا میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

بہر حال ماسٹر رام چندر کی نثر میں جدت سے قریب ہونے کی للک اور مشینی دور کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ اس میں زندگی کی کشمکش کا احساس بھی ہے۔ ان کی مضمون نگاری کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ انھوں نے اس کی پہلی اینٹ رکھی جس پر آگے چل کر مضمون نگاری کی ایک توانا، صحت مند اور متنوع اسالیب کی حامل عمارت کھڑی ہوگئی۔ ○○